غزل

میں ہجر کے عذاب سے انجام بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

آنے میں گھر مرے، تجھے جتنی جھجک رہی
اس درجہ تو میں بے سروسامان بھی نہ تھی

اتنا سمجھ چکی تھی میں اس کے مزاج کو
وہ جارہا تھا اور میں حیران بھی نہ تھی

آراستہ تو خیر نہ تھی زندگی کبھی
پر تجھ سے قبل اتنی پریشان بھی نہ تھی

جس جا مکین بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اس گھر میں ایک شام کی مہمان بھی نہ تھی

دنیا کو دیکھتی رہی جس کی نظر سے میں
اس آنکھ میں مرے لئے پہچان بھی نہ تھی

روتی رہی اگر تو میں مجبور تھی بہت
وہ رات کاٹنی کوئی آسان بھی نہ تھی

نقدِ وفا کو چشمِ خریدار کیا ملے
اس جنس کے لئے کوئی دوکان بھی نہ تھی

غزل

اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اُس کی طرح یاد کرے

دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھلا در اس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اتنا حیراں ہو مری بے طلبی کے آگے
وا قفس میں کوئی در خود مرا صیاد کرے

سلبِ بینائی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
روشنی چھونے کی خواہش کوئی شب زاد کرے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
وہی معصوم ہے ہر بات پہ جو صاد کرے

جب لہو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضیِ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

اس کی مٹھی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے